ناول ''لہو جو ہم بہا کے آئے'': تجزیاتی مطالعہ

عبدالرزاق پرویز
پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

ڈاکٹر نذر عابد
صدر شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

Abstract:

The creation of a new state in sub-continent was the result of a lot of sacrifices rendered by the muslim community of this region. In order to gain their religious, political and economic freedom, thousands of muslim families had to face such circumstances under which they had lost their assets, women and children. The novel 'LAHU JO HAM BAHA KY AAEY' written by Mr. Inaytullah elaborates such incidents which took place in the eve of migration after partition. This novel describes the decline of social as well as moral values. It shows that in order to subdue the Muslim nation, the extremists shed rivers of blood of

innocent people with cruelty. It tells the painful story of caravans which arrived in Pakistan after sacrificing and loss of their beloved ones. In this article, the authors have carried out a critical and analytical study of this novel. This critical study deals with the style of the novelist that how successfully he has presented the whole scenario of the said historical turning point of sub- continent.

کلیدی الفاظ :برصغیر،تحریک آزادی، انگریز ،ہندو، سکھ، مسلمان، فسادات، پاکستان

برصغیر کے مسلمانوں نے انگریز سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جتنی قربانیاں دیں شاید ہی کسی دوسری قوم نے آزادی کے حصول کے لیے اتنی قربانیاں دی ہوں۔ پاکستان کا حصول ایک داستان خونچکاں کا نام ہے۔ یہ مملکت خداداد لاکھوں انسانوں کی قربانیوں کے بعد معرض وجود میں آئی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے ہزاروں معصوم عورتوں کی عزتوں کو پامال کیا،ان گنت بیٹے یتیم ہو گئے اور کتنی سہاگنوں کے سہاگ لٹے تب آزادی کی منزل قریب آئی۔ یہ ارض پاک ان لاکھوں بیٹیوں کا تحفہ ہے جو بے حرمتی کی بھینٹ چڑھیں۔ یہ پاکستان ان بے گناہ معصوم ماؤں کی عطا ہے جن کے پیٹ چاک کر کے دشمن نے ان کے نامولود بچوں کو قتل کر دیا۔ یہ اس دور کی سچی داستان ہے جب آزادی کی تحریک چلی اور ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں اور صرف ایک ہی نعرہ ہر طرف سنائی دیتا تھا "لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان" اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ یہ فسادات سیاسی اور مذہبی سطح کے تھے۔ یہ فسادات دو قوموں کے اختلافات کی وجہ سے تھے جو برصغیر کی تقسیم پر منتج ہوئے۔ ان فسادات نے لاکھوں بے گناہ گھرانوں کو اجاڑا۔ اس تقسیم کے حوالے سے معروف ماہر قانون اے جی نورانی لکھتے ہیں:

"تقسیم ہند کا واقعہ دنیا کے دس سب سے زیادہ المناک حادثوں میں سے ایک ہے۔

پچاس سال بعد بھی یہ زخم رس رہا ہے۔"(۱)

تقسیم ہند کے نتیجے میں پھوٹنے والے ان خونی فسادات نے سب سے زیادہ مشرقی پنجاب کو متاثر کیا۔ جہاں دنیا نے بے گناہ انسانوں کی خون کی ندیاں بہتی دیکھیں۔ بر صغیر کی تاریخ کے اس موڑ پر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے یہاں کی مجموعی آبادی پر بالعموم اور خصوصاً مسلمانوں کی زندگیوں پر بے پناہ اثرات مرتب ہوئے۔ بر صغیر کی تاریخ پر مسلمانوں نے شاندار نقوش چھوڑے تھے لیکن ۱۷۵۷ سے ۱۸۵۷ تک کے واقعات ان کی زندگی پر سوالیہ نشان بن کر ابھرے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ایک مبہم سا خوف مسلمانوں کی نفسیاتی زندگی کا حصہ بنتا گیا۔ انگریز سامراج کی مکارانہ چالوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی۔ واضح طور پر محسوس ہونے لگا تھا کہ انگریزوں کی رخصت کے بعد مسلمان ہندو اکثریت کے پنجہ استبداد میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے جائیں گے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ وقت کی ضرورت تھی۔ سر سید احمد خاں کی دور رس نگاہوں نے بہت پہلے ان حالات کو بھانپ لیا تھا۔ اسی حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

> "اب ہندو اور مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔،،(۲)

مسلم راہنماؤں اور خاص طور پر قائد اعظم محمد علی جناح نے دلائل کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم قرار دیا۔ دونوں قوموں کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے انھوں نے کہا؛

> "The difference between Hindus rooted and and Muslims is deep ineradicable. We are a nation with our own distinctive culture and civilization, language and literature, art and architecture, names nomenclature, legal laws and moral codes, customs and

calendar, history and traditions,
aptitude and ambitions."(3)

یوں دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کے نقشے پر
پاکستان کے نام سے ایک مسلم ریاست کا قیام عمل میں
آیا۔تاہم تقسیم کے بعد ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے اور
نتیجے کے طور پر ایسے حالات وواقعات پیش آئے جن کا
تذکرہ آغاز میں کیا گیا ہے۔

ان واقعات کا ادیبوں کی زندگیوں پر بھی اثر ہوا اور انہوں نے قلم کا سہارا لیتے ہوئے ان واقعات کو قلم بند بھی کیا۔ادب پر ان واقعات کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ بیشتر ادیبوں نے ان فسادات کے نتیجے میں انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے نفسیاتی اثرات کو موضوع بنایا۔ان موضوعات کو شعری و نثری ہر دو صورتوں میں مختلف طریقوں سے تحریر کیا جاتا رہا۔ دیگر اصناف کی طرح اردو ناول نے بھی ان فسادات اور حالات کو براہ راست موضوع بنایا اور کئی ناول نگاروں نے ۱۹۴۷ء کی آزادی کی اس جنگ کو بطور موضوع اپنایا۔

۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی کے فسادات اور ان فسادات کی صورت میں ہونے والی ہجرت ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔اس نے دونوں اطراف کے انسانوں پر منفی اثرات مرتب کئے۔ اس واقعہ نے خارجی سطح پر خطہ کی تاریخ کا رخ موڑ دیا اور معاشرتی سطح پر صدیوں پرانی ثقافتی و تہذیبی روایات کو شکست دی۔اس واقعہ کے کئی پہلو تھے لیکن بنیادی طور پر یہ تمام منظر نامہ خون ریزی، لوٹ مار، انسانی حیوانیت اور آبرو ریزی سے عبارت ہے۔ افسانوی ادب نے ان مناظر کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا لیکن ناول اپنے وسیع کینوس کی وجہ سے افسانہ پر سبقت لے گیا اور اس کشت و خون اور انسانی وحشت کو افسانہ کی نسبت زیادہ موثر انداز میں بیان کیا۔ ہجرت کے فسادات کو موضوع بنانے والے ناولوں میں نسیم حجازی کا "خاک اور خون" ایم اسلم کا "رقص ابلیس"، عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول" اور قاضی عبدالستار کا "شب گزیدہ" جیسے ناول ان فسادات کا احاطہ کرتے ہیں۔انہی ناول نگاروں میں ایک نام عنایت اللہ التمش کا آتا ہے جس کے ناولوں کا ایک نمایاں موضوع ہجرت اور جنگی وقائع نگاری بھی ہے۔

عنایت اللہ نے اپنے ناولوں میں قیام پاکستان کے وقت ہونے والی خانہ جنگی ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے موضوع پر لکھے جانے والے ناولوں سے شہرت پائی۔ ماہنامہ حکایت کے ایڈیٹر عنایت اللہ کی شہرت ان کی شب و روز کی محنت سے نمایاں ہوتی ہے۔

ان کا ناول ''لہو جو ہم بہا کے آئے'' اپنے عنوان سے ہی ان قافلوں کی داستان سناتا نظر آتا ہے جو ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آنے والے اپنی جانیں لٹاتے اور خون بہاتے آئے تھے۔

عنایت اللہ کا یہ ناول پاکستان کے حصول کے لئے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرنے والے افراد کی سچی اور دل گداز داستان ہے۔ اس داستان کا مرکزی کردار ہی اس کا راوی ہے جس نے اپنے پاکستان پہنچنے کی ساری داستان رقم کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کی ریاست پٹیالہ کے چھوٹے سے قصبے دوراہا میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ جہاں سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ باہمی اخوت سے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر آزادی کی تحریک زور پکڑتی ہے اور ہر طرف خون ریزی کا ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس ناول میں عنایت اللہ نے غیر جانبداری سے ان دو قوموں کے تعلقات کو بیان کیا ہے۔ جن میں سکھ اور مسلمان شامل ہیں لیکن ان دونوں کو آپس میں لڑانے والی تیسرے طاقت ہندو کی ہے جو ہندوستان پر اپنی حکومت چاہتی ہے اور وہ سکھ قوم کو اپنی عیاری سے مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگنے کو تیار کرتی ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں ایسے دل خراش واقعات کو بیان کیا ہے جن سے بہت سے ایسے حقائق بے نقاب ہوئے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ برصغیر کے اس خطہ کو کس طرح منصوبہ بندی کے تحت جنگ کے لئے تیار کیا گیا اور اس جنگ میں بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ تحریک آزادی کے وقت بے گناہ لوگوں پر کئے جانے والے مظالم آج بھی ان کی نفسیاتی زندگی کو بے چین کئے ہوئے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ہندو اس بات پر راضی نہ تھے کہ ہندوستان کا یہ ٹکڑا مسلمانوں کو علاحدہ دیا جائے جہاں یہ لوگ آزادی سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ ہندوؤں کی نفرت کی ایک مثال ناول میں اس طرح ملتی ہے:

"ہندو ماسٹر رام سودھی یہ خبر پڑھ کر غصے میں
لال پیلا ہو رہا تھا نزدیک ہی ہمارا کلاس روم تھا۔
شور سن کر وہ غصے میں اٹھا اس کے ایک ہاتھ میں
اخبار اور دوسرے میں بید کی چھڑی تھی۔
میرے بڑے بھائی رفیق کلاس کے دروازے
میں کھڑے تھے جو غالباً باہر جا رہے تھے۔ بڑے
بھائی کلاس میں رومی ٹوپی پہنے تھے۔ رام سوامی
نے آتے ہی میرے بڑے بھائی پر اندھا دھند بید
کی چھڑی برسانی شروع کر دی۔"

"مسلا کتا۔۔۔۔۔۔۔۔ رام سوامی نے غصے سے
کہا"

"حرام زادہ"(۴)

گویا ہندو مسلم نفرت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ مسلمانوں کو اس سر زمین سے نیست و نابود کرنے کے درپے تھے لیکن اس کے برعکس سکھ قوم مسلمانوں کے ساتھ الجھنے کو تیار نہ تھی۔ سکھ قوم کو ہندوؤں نے ورغلا کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے اکسایا کہ سکھوں کو علیحدہ خالصتان کے نام سے آزاد ریاست دی جائے گی۔ ناول میں ایک کردار "دربار سنگھ" کا ہے جو پورے گاؤں کے لئے وحشت کی علامت ہے جبکہ مسلمان گھرانوں سے اس کی عقیدت و محبت اس بات بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کو سکھ قوم کے سپرد کرنے سے کتراتا ہے اور اپنی عزت کو مسلمان کے گھر میں محفوظ جانتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ناول کا ایک کردار "پچھتر سنگھ" جو مسلمانوں سے اس حد تک نفرت کرتا ہے کہ انہیں اس سر زمین پہ رہنے کا کوئی حق نہیں دینا چاہتا۔ اس کے پیچھے ہندوؤں کی نفرت ہے جو انہوں نے پچھتر سنگھ کے دماغ میں ڈالی ہے کہ تمہارا دشمن مسلمان ہے نہ کہ ہندو۔ مسلمان آزادی کی اس تحریک کو بغیر خون ریزی کے مکمل کرنے کے خواہاں تھے۔ جبکہ ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں زندگی گزارنا اس قدر مشکل ہو چکا تھا کہ چاروں اطراف سے خون کی ندیاں بہانے کی آوازیں آتی تھیں۔ مسلمان مصلحت چاہتے تھے جبکہ ہندو خون ریزی ۔ایک مقام پر عنایت اللہ لکھتے ہیں:

"حصول پاکستان کی جنگ عروج پر پہنچ چکی تھی
مشرقی پنجاب کی فضا دن بدن کشیدہ ہوتی چلی جا
رہی تھی اب تو علاقے کے لوگ گھور گھور کر
دیکھتے تھے۔ ہندوؤں کی نظریں بدل چکی تھیں۔
جو ہندو اور سکھ بڑے ادب سے گذرتے تھے۔
ان کا رویہ بدل چکا تھا۔ وقت کی مصلحت یہ تھی
کہ اس ہندو مسلم تنازعہ میں خاموشی اختیار کی
جاتی لیکن سیاسی فضا خراب ہو چکی تھی۔"(۵)

ناول نگار نے سکھ کرداروں کو ایک طرف مسلمانوں کا خیر خواہ جبکہ بعض کرداروں کو مسلمانوں کے جانی دشمن کے طور پر دکھایا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں قومیں آپس میں اکٹھا رہ سکتی تھیں لیکن ان کے درمیان فتنہ کی جڑ ہندو نے پیدا کی۔ اس ناول میں عنایت اللہ نے کھل کر اس ہجرت کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بات واضح کرنے کی سعی کی ہے کہ آزادی کی اس تحریک میں بے گناہ مسلمانوں کو جان بوجھ کر قتل کیا گیا۔ اس ناول میں بچھتر سنگھ کا کردار مسلمانوں سے نفرت کی دلیل ہے۔ جو یہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کو علاحدہ وطن ملے۔ وہ ایک مقام پر جلسے میں مسلمانوں کے خلاف تقریر کرتا ہے:

"قیام پاکستان کی منزل قریب آرہی تھی۔ ہندوؤں
اور سکھوں میں اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندو اور
اکالی سنگھ ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور برچھیاں لے
کر پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز
نعرے لگا رہے تھے۔ بچھتر سنگھ اپنی تقریروں میں
مسلمانوں کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ یہ جناح کو
چندے بھیجتا ہے ہم اسے اس علاقہ سے زندہ نہیں
جانے دیں گے"۔(۶)

ناول نگار نے یہاں ہندوؤں کے رویہ کی عکاسی کی ہے جو قائد کی اس تحریک کو کچلنے کے لئے کوشش کر رہے تھے اور ان کا یہ تشدد آمیز رویہ ان کی سوچ کا آئینہ دار تھا۔ ناول نگار نے برصغیر پر کئی سو سال حکومت کرنے والے مسلمانوں کو اس قدر لاچار اور بے بس دکھایا ہے کہ وہ جن قوموں پر حکومت کرتے رہے تھے آج اس قدر بے بس ہو گئے ہیں کہ ان سے جان بچاتے پھر رہے ہیں۔ ناول کے واقعات وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور آزادی کی یہ تحریک مسلمانوں کے لئے ایک طرف خوشیاں جبکہ اس کے

برعکس بے شمار خاندانوں کے لئے خون کی ندیاں بہاتی نظر آتی ہے۔ایک طرف مسلمان یہ سوچ رہے تھے کہ ہمیں آزاد ملک مل جائے گا اور ہم پاکستان میں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی بسر کریں گے جب کہ بے شمار خاندان پریشانی کے عالم میں اپنے پیاروں کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔وہ لوگ نفسیاتی طور پر خوف زدہ ہو چکے تھے کہ آزادی کی یہ تحریک ان کے خون سے مکمل ہو گی۔ ناول میں ایک کردار مسلمان عورت ''مائی فاتاں'' کا ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ ہم تو یہاں صدیوں سے رہ رہے ہیں اس لئے ہمیں یہ لوگ کیوں ظلم کا نشانہ بنائیں گے۔

ناول کے مرکزی کردار کا والد یہاں اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ان کی آنکھوں میں خون اتر چکا ہے۔ان کی نظروں میں اب مسلمان کی عزت ختم ہو چکی ہے اور اب یہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ کب موقع ملے اور بے گناہ مسلمانوں کے جسموں کو اپنے نیزوں پر لٹکائیں۔

عنایت اللہ نے ناول میں ہر نام سنگھ، سکھدیو سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ جیسے ذیلی کرداروں کو بھی ناول میں پیش کیا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنا وجود کھوتے جاتے ہیں۔ہندوؤں نے مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کا تہیہ کر لیا تھا اور وہ ہر حال میں یہ چاہتے تھے کہ کوئی بھی مسلمان خیریت سے ہجرت کر کے مغربی پنجاب نہ چلا جائے۔دربار سنگھ جو پورے ناول میں اخوت اور بھائی چارے کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ہندو سکھ قوم کو استعمال کر رہے ہیں۔ایک مقام پر دربار سنگھ اور بچھتر سنگھ کے درمیان دھرم پر مکالمہ ہوتا ہے جس میں دربار سنگھ یہ بات باور کراتا ہے کہ ہندو مسلمان اور سکھ قوم کے خیر خواہ نہیں ہیں:

''میں سمجھ گیا تم کیوں آئے ہو''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بچھتر سنگھ نے کہا''

''تم سب میرے دھرم کے بھائی ہو، مسلمان ہمارے دشمن ہیں۔دو سو برس بعد ہمیں موقع ملا ہے ہم حساب برابر کریں''

''کیوں سکھ دھرم بدنام کرتے ہو بچھتر سنگھ''

''دھرم اجازت نہیں دیتا کہ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے جائیں''انہوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟''

''بچھتر سنگھ نے کہا۔۔۔۔۔۔۔ سب کا یہی فیصلہ ہے امرتسر سے پٹیالہ تک خون کی ندیاں بہادیں۔''

"ہمارے سردار ماسٹر تارا سنگھ لاہور اسمبلی کی سیڑھیوں پر اپنی
کرپان نکال کر مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کر
چکے ہیں۔" (۷)

ناول نگار نے یہاں سکھوں کے دو کرداروں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ایک مسلمانوں کے ساتھ الجھنا نہیں چاہتا جبکہ دوسرا کردار مسلمانوں کا جانی دشمن ہے جو بار بار اپنی ذاتی نفرت کو دھرم کا سہارا لے کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا چاہتا ہے۔ عنایت اللہ نے ناول میں حقیقی واقعات کو بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے یہاں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سکھ اور مسلمان دونوں قومیں آپس میں مل کر رہ سکتی تھیں ہندو نے اپنے مفادات کے پیش نظر ان کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا اور دونوں اطراف میں بے گناہ لوگوں کو قتل کروایا۔ تقسیم کے اس عمل میں جہاں سکھوں نے بے گناہ لوگوں کا قتل کیا وہیں فرقہ وارانہ تنظیموں نے بھی اس سانحہ کو ہوا دی۔ ہجرت کے اس سانحہ میں ہندو یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کا مطلب صرف ہندو ہے۔ اس حوالہ سے شیخ غیاث الدین لکھتے ہیں:

"ہندو مہاسبھا یہ نعرے لگاتی رہی کہ ہندو ہی قوم ہے
جسے ہندوستان میں رہنا ہے ہندو بن کر رہے ورنہ نہ
رہے۔ اسے سب آداب زندگی ہندوؤں کا اختیار کرنا
ہوگا، دوسری طرف مسلم لیگ، اور دیگر اسلامی
تنظیمیں یہ اعلان کر چکی تھیں کہ مسلمان الگ قوم
ہے ان کی تہذیب، کلچر، معیار زندگی، عبادت و
ریاضت سب جدا ہے۔"(۸)

سکھ قوم کی مسلمانوں سے وابستگی ہجرت کے وقت اپنے پیاروں سے کہیں زیادہ تھی جو ان کی انسان دوستی کی واضح مثال تھی اور مذہب کی بجائے انسانیت کی بنیاد پر قائم تھی۔ ناول میں دربار سنگھ اور اس کا سارا خاندان اس بھائی چارے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ تقسیم کے وقت بعض سکھ گھرانوں نے مسلمانوں کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی لیکن اکثریت نے تلواریں اٹھائیں۔ ناول میں "مائی فاتاں" کا کردار بار بار اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہندوستان میں قیام پذیر یہ دونوں قومیں عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے زندگی گزارنے کو ترجیح دیتی تھیں لیکن ہندو آزادی کے وقت یہ سب بھول چکا تھا اور مسلمانوں کی جانوں کے درپے تھا۔

اس کہانی کا مرکزی کردار سید سعید احمد اختر اور ان کے والد سید بشیر احمد جو ایک سرکاری عہدے پر فائز تھے پورا علاقہ ان کو احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور ان کا حسن اخلاق پورے گاؤں میں بطور مسلمان قوم کی نمائندگی تھی۔ انہوں نے آزادی کی اس تحریک کے دوران ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کا تن دہی سے مقابلہ کیا اور صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اس صبح کا انتظار کیا جب خود کو محفوظ وطن میں دیکھیں گے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ اپنے خاندان اور دوسرے مسلمان گھرانوں کے ساتھ آزاد سرزمین پر اپنے پاؤں رکھیں۔ دربار سنگھ ہر مقام پر سید گھرانے کی حفاظت کرتا ہے اور بعض مقامات پر اسے اس بات پر افسوس ہوتا ہے جہاں کسی مذہب، دھرم کو نہیں مانا جاتا۔ وہاں صرف وحشت کا راج اور انسانیت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ ایک مقام پر دربار سنگھ افسوس کے ساتھ انسانیت سے شکوہ کرتا ہے:

"مہاراج!"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاتھ جوڑ کر بولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"آج ہماری اس دھرتی سے انسانیت رخصت ہو گئی ہے" (۹)

ناول میں دربار سنگھ اور اس کے بیٹے خالصتان کا نعرہ لگاتے نظر آتے ہیں لیکن وہ ایسا خالصتان نہیں چاہتے جو مسلمانوں کے خون سے حاصل ہو۔ یہ آزادی کی تحریک جہاں انسانوں کی زندگیاں نگل رہی تھی وہیں ان کو نفسیاتی طور پر پاگل کر رہی تھی اور لوگ سوچ رہے تھے کہ ہم اپنے خاندانوں کو کیسے محفوظ مقام پر لے جانے میں کامیاب ہوں گے۔

عنایت اللہ نے ناول میں جہاں لوگوں کی نفسیاتی زندگی پر تحریک آزادی کے اثرات دکھانے کی کوشش کی ہے وہیں انہوں نے یہ بتانے کی سعی بھی کی ہے کہ مسلمان جو اس سرزمین پر کئی صدیوں تک حکومت کرتے رہے تھے آج کیسے زندگیاں بچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ہندوستان کی ریاست پٹیالہ مسلمانوں کی اکثریت کے سبب محفوظ پناہ گاہ تھی۔ اس لئے سید بشیر احمد نے گاوں سے ہجرت کرنے میں عافیت محسوس کی کیونکہ اس گاؤں کی غیر مسلم آبادی ان کی جانوں کے دشمن بن چکی تھی۔ ناول نگار نے سکھوں کے اندر بھی مختلف سوچ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ سکھ برادری کے کچھ لوگ مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے جبکہ دوسری طرف کچھ لوگ ان کے قتل عام کے درپے تھے ۔ سکھ ایسی قوم تھی جسے اپنے دھرم کے دوسرے انسان پر یقین نہ تھا۔ ناول کے مطابق:

"سکھ ریاست پٹیالہ مشرقی پنجاب کی سب سے بڑی ریاست
تھی یہ مسلمانوں ہی نے اپنی فیاضی اور دریادلی سے سکھوں کو
بخشی تھی۔ موجودہ مہاراجہ اپنے آباؤاجداد کی ساتویں پشت سے

تعلق رکھتا تھا۔اس کا نام یادوندر سنگھ تھا۔اس کا باپ سابقہ راجہ
بھوپندر سنگھ قابل اور اعلیٰ منتظم تھا۔اس کے دور میں ریاست کا
نظم و نسق مثالی تھا۔ریاست کے تمام کلیدی عہدوں پر مسلمان
مقرر کر رکھے تھے۔وہ ہندو کو سازشی سمجھتا اور ان سے نفرت
کرتا تھا۔"(۱۰)

ناول نگار نے یہاں مسلمانوں کو ذہین، محنتی اور بااخلاق ثابت کیا ہے اور ہندو کو ایک چالاک اور فریبی قوم کا درجہ دیا ہے جو اس شیطانی آگ کو جلانے میں پیش پیش تھے۔جو لوگ اس ہجرت میں اپنوں کو بچانے میں کامیاب ہوئے ان کی جسمانی قوت کو اس قدر غیر فعال کر دیا گیا کہ وہ آنے والی نسلوں کو خوف کی یہ داستان سناتے رہیں۔انسانوں سے انسانیت کو چھین لیا گیا۔مسلمانوں کو اس آزادی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔آزادی کی اس خونریزی کے متعلق شعیب عتیق لکھتے ہیں:

"۱۹۴۷ کے جنگی فسادات میں انسان کے ہاتھوں انسان پر جو
گذر رہی تھی اسے دیکھ کر حیوانیت بھی کانپ اٹھی۔انسان بطور
ماں، بہن، بیٹی، باپ، بچہ بطور مسلمان اس آگ میں جل رہا تھا۔
بات یہ نہیں کہ برصغیر میں قتل و غارت یا جنگ و جدل کے
واقعات اس سے قبل وقوع پذیر نہیں ہوئے اس سے قبل خانہ
جنگی ہو یا بین الاقوامی جنگ اس نے زندگی کے ہر رخ کو اس
انداز میں تہہ و بالا نہیں کیا۔"(۱۱)

قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی کو ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنی پڑی لیکن یہ ہجرت اپنے جلو میں خون ریز فسادات بھی لے کر آئی۔مسلمان اپنے پیاروں کو ایک طرف انبالہ، لدھیانہ اور جالندھر جیسی محفوظ پناہ گاہوں میں لے جا رہے تھے اور دوسری طرف پاکستان کی طرف ہجرت بھی کر رہے تھے۔اس وقت ریاست پٹیالہ کی دس ہزار کی فوج دوسری جنگ عظیم سے لوٹی تھی اس میں مسلمان بھی شامل تھے ان کو غیر فعال رکھا گیا اور مسلمان بستیوں کو بے تحاشا ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔اگر کوئی مسلمان مزاحمت کی کوشش کرتا تو اس کی سزا پورے دیہات کو یوں دی جاتی کہ آگ لگا کر اسے خاک کا ڈھیر بنا دیا جاتا اور مزاحمت کو تشدد آمیز انداز میں کچل دیا جاتا۔

ناول کے مرکزی کردار کا آبائی گھر ریاست پٹیالہ میں تھا وہاں بھی حالات خراب ہوتے دیکھ کر وہ مایوسی کا اظہار کرتا نظر آتا ہے لیکن اس وقت چونکہ انگریز حکومت پاکستان کے قیام کا اعلان کر چکی تھی اس لیے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی لیکن پٹیالہ شہر سکھوں اور ہندوؤں کی آماج گاہ بن چکا تھا اس لیے یہ دونوں شر پسند عناصر مل کر مسلمانوں کے خلاف جلوس نکال رہے تھے۔ وہ ہاتھوں میں تلواریں اور کرپانیں لیے مسلمانوں کی آزادی کو کچلنے کے لیے کمر بستہ تھے۔ ناول میں ذیلی کردار اکامی فوج کا سینا پتی ماسٹر تارا سنگھ جلوسوں میں یہ تقریریں کر رہا تھا کہ خالصان کی بنیادیں مسلمانوں کی لاشوں کے انبار پر رکھی جائیں گی ۔ سکھوں کو یہ امید تھی کہ مسلمانوں کے قتل عام سے خالصتان مل جائے گا اور مسلمانوں کی بہو، بیٹیاں ہماری آزادی کی اس گھڑی میں برہنہ مارچ کریں گی۔ امرتسر کے درباروں میں خالصتان کے جھنڈے مسلمانوں کے خون میں رنگ کر لہرائے جائیں گے۔ سکھوں کو مسلمانوں کے اسی قدر خلاف کرنے میں ہندو نے بنیادی کردار ادا کیا اور ان کے مرکزی لیڈروں کو ہندوؤں نے ہلاکو خاں اور چنگیز خاں کی بہادری سے مشابہت دی اور یہ کہا گیا کہ تم انگریز اور ہندو کی غلامی کرو تمہیں ہم آزاد کر دیں گے۔ ہندو نے سکھوں کی سوچ کو اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں صرف مسلمانوں کا خون ہی خون نظر آتا تھا۔ ہندو کی اس مکاری کو عنایت اللہ نے اپنے ناول میں یوں پیش کیا ہے:

> ”ادھر ہندوستان کی جنگ آزادی کے سب سے
> بڑے ہیرو مہاتما گاندھی کا دل آگ اور خون کے
> طوفان کو دیکھ کر گھبرا رہا تھا وہ ہندوستانیوں کو عدم
> تشدد کا پرچار کر رہا تھا لیکن اس کے چیلے بنگال اور
> مشرقی پنجاب میں خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔
> مہاتما گاندھی مرن بھرت کی دھمکیاں دے رہا
> تھا جو محض ایک فریب تھا ہندو کی عیاری تھی۔“
> (۱۲)

ناول کا ایک کردار حاجی لطیف ہے جس کی دکان پٹیالہ شہر میں مسلمانوں کی اکثریت کے علاقہ شیرانوالہ چوک کے درمیان تھی۔ حاجی لطیف امن پسند شخصیت اور ہر دل عزیز انسان تھے۔ جب وہ ہندوؤں کی وحشت کا نشانہ بنے تو وہاں کی اکثریت نے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے توپ گھاٹ چلے جانے کو ترجیح دی لیکن وہاں ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کا قتل عام اس طرح کیا گیا جیسے بھیڑوں کے ریوڑ کو اکٹھا باندھ کر ذبح خانہ میں ذبح کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی بربریت سے بچنے کے لیے مسجدوں میں

اپنے آپ کو محصور کر لیا لیکن یہ لوگ وہاں بھی جانوروں کی طرح کاٹ دیئے گئے اور عورتوں نے اپنی عزتوں کو بچانے کے لیے خود اپنی جانیں لے لیں یا مسلمانوں نے بیشتر اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیا تا کہ ان کی عزت محفوظ رہ سکے۔

ستمبر 1947 کا مہینہ مسلمانوں کے لیے عذاب بن کر نازل ہوا۔ مسلمانوں کو توپ گھاٹ میں ڈال کر ہندوؤں نے وہاں خون کی وہ ہولی کھیلی جسے دیکھ کر انسانیت کانپ اٹھی۔ ہندوؤں نے وہاں قیامت صغریٰ برپا کر دی۔ نہتے مسلمانوں کو ہلاک ہوتے دیکھ کر یہ محسوس کیا جا سکتا تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھی خالصتان کی عمارت کی بنیادیں اسی میدان میں مسلمانوں کی لاشوں پہ رکھ رہے ہوں۔

عنایت اللہ نے یہاں ہندوؤں کی چال بازی اور ان کی وحشت کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگریز برصغیر سے جاتے ہوئے ہندووں کو قتل و غارت گری اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک ورثے میں دے کر گئے تھے۔

ناول نگار نے ہندوؤں کی وحشت کا ایک منظر ناول میں اس انداز میں بیان کیا ہے:

> ”چند گز اور آگے گئے تو ایک بھیانک منظر دیکھا یہ بالکل برہنہ
> عورتوں کی لاشیں تھیں۔ یہ بھی سڑک کے عین درمیان میں
> ایک لائن میں رکھی گئی تھیں درندگی کا اس سے زیادہ ہولناک
> اور شرمناک مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان کی چھاتیاں کٹی
> تھیں ان لاشوں کے سروں کے پیچھے ایک چھڑی گاڑ کر گتے
> کے ایک ٹکڑے پر لکھا تھا:
>
> ”یہ ہے تمہارا پاکستان“۔(۱۳)

آزادی کی منزل کے حصول کی خاطر مسلمانوں نے ایسے ایسے ظلم و ستم سہے کہ تاریخ بھی جنھیں لکھتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ عنایت اللہ نے اپنے ناول میں مسلمانوں کی عورتوں پر کیے جانے والے ظلم کی داستان کو بڑے دردناک انداز میں رقم کیا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار خوف اور دہشت کے منظر کو دیکھ کر زندہ لاش میں تبدیل ہو جاتا ہے اور نفسیاتی طور شدید دباو کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کو کٹتے دیکھ کر اس پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک مقام پر ہندؤوں کی بربریت کا منظر دیکھ کر اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے:

"اف خدا کی پناہ یہ کس قدر بھیانک منظر تھا آج پینتالیس برس
گزرنے کو آئے ہیں میں یہ منظر آج بھی نہیں بھلا سکا دروازے
پر بہت سے کٹے ہوئے انسانی سر لٹک رہے تھے دروازے سے
تقریباً بیس گز پیچھے ایک نوجوان برہنہ لڑکی کی لاش ایک مکان
کے چبوترے پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے رکھی گئی تھی
جیسے بیٹھی ہوئی لڑکی کی برہنہ ٹانگیں چبوترے سے نیچے لٹک
رہی تھیں"۔(۱۴)

سکھوں اور ہندوؤں نے مل کر مسلمان عورتوں کی عزتوں کو پامال کیا اور بعد میں تلواروں سے کاٹ کر نیزوں پر چڑھا دیا گیا۔اس ہولناک واقعہ نے پوری قوم کو نہ بھولنے والا صدمے سے دوچار کیا۔وہ قوم جس نے کبھی پورے برصغیر کو فتح کیا تھا،اس وقت غیر محفوظ اور بے بس نظر آرہی تھی۔

پٹیالہ ریاست قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں کی محفوظ پناہ گاہ تھی وہاں بھی ان شدت پسندوں نے خون کی ندیاں بہادیں۔مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی نصف آبادی اس قتل وغارت گری کا شکار ہوئی کر فیو لگا دیا گیا اور پوری دنیا سے رابطہ ٹوٹ گیا صرف وہاں پٹیالہ شہر میں سکھ فروٹ سبزی بیچنے والوں سے اندر کے حالات کا اندازہ ہوتا۔مسلمانوں کو اس قدر اذیت اور کرب کے عالم میں ہجرت کرنا پڑی۔

ناول نگار ایک مقام پر مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے آج کے نوجوانوں کو یاد دلاتا ہے کہ جن ہندووں کی بنائی گئی فلموں کے وہ دلدادہ ہیں انھوں نے ہماری بزرگ نسل پر کیا کیا ظلم ڈھائے:

"میں پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں کو جو ہندوؤں کی بنائی
ہوئی فلموں کی ثقافت کے شیدائی ہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں
کہ ایک ہی واقعہ نہیں ہوا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمان
عورتوں کو برہنہ کر کے سڑکوں پر جلوس نکالا تھا۔گڑھ مکتیشر
میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور مسلمان عورتوں کے
پیٹ چاک کر کے جو حاملہ تھیں بچے نکالے اور انہیں برچھوں
کی انیوں پر اڑس کر وحشیانہ طریقے سے ناچتے تھے"۔(۱۵)

عنایت اللہ نے اپنے اس ناول میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی بربریت کو ایسے پیرائے میں پیش کیا ہے کہ جسے سن کر انسانیت بھی اپنا منہ چھپالے۔ناول نگار نے سکھوں کے سرکردہ سرداروں کو

شدت سے یہ احساس دلایا ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ جب تم لوگ (سکھ) بھی جان جاؤ گے کہ ہندو ایک مکار اور شر پسند قوم ہے۔ایک مقام پر سید بشیر احمد اور کرنل گور بخش سنگھ کے درمیان ہونے والے مکالمے کا احوال بیان کیا گیا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ سکھ قوم کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا گیا:

> ''کرنل گربخش سنگھ کیمپ میں آیا۔بشیر احمد کو طویل غیر حاضری کی وجہ بتائی گئی وہ کہتا ہے کہ کشمیر میں دونوں ریاستوں کی آرمی مکمل تباہ ہو رہی ہے۔کرنل گور بخش سنگھ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو گالیاں دیتا ہے۔ماسٹر تارا سنگھ اور سردار بلا پوسنگھ کو گندی گالیوں سے نوازا۔''

> ''بشیر احمد تم تو پاکستان چلے جاؤ گے''

> ''ان ہندوؤں نے ہم صدیوں سے اکٹھے رہنے والوں کو دشمن بنا دیا''۔(۱۶)

بشیر احمد نے کہا'' تم دیکھو گے بہت جلد سکھ لیڈر اور پوری سکھ قوم پچھتائے گی۔ہندو کی مکاری سے جس نے پہلے مسلمان کو پھر سکھ کو ڈنگ مارا ہے"

ناول کی کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے پاکستان کا وجود اندھیری گلی سے نکلتا نظر آتا ہے اور آزادی کی کرنیں نمایاں ہوتی نظر آتی ہیں۔ایک طویل جدوجہد کے بعد مسلمان ہندوؤں کے غلبے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔مسلمان بذریعہ ریل گاڑی اٹاری اسٹیشن سے لاہور جانے کے لئے نکلتے ہیں۔پاکستان کی مقامی آبادی بے سروسامان بھائیوں کے لئے محبت اور جان و مال نچھاور کرنے کو تیار ہوتی ہے۔وہ مسلمان جو ماسٹر تارا سنگھ جیسے لوگوں کے مظالم سہتے پاکستان پہنچتے ہیں ان کے لئے یہ سرزمین ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ عنایت اللہ ان بے سروسامان تارکین وطن کے جذبات کی عکاسی اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''یہ آزادی کی پہلی رات تھی خوف ، دہشت اور وسوسوں سے آزاد ہو کر مدت کے بعد ہم گہری نیند سوئے اپنا ملک اپنا پاکستان ہمارے تصورات سے بڑھ کر حسین تھا کتنی قربانیوں کے بعد ہم نے حاصل کیا''۔(۱۷)

آزادی کی یہ داستان خونچکاں اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔آزادی کی یہ داستان مسلمانوں کے خون سے لکھی گئی ہے۔ناول کا راوی اچانک لاہور پہنچتا ہے۔جو اس اجنبی دنیا میں مذہب کی بنیاد پر امید لئے ہے کہ

اب میں اس جگہ پہنچ چکا ہوں جہاں ہمارے بڑوں نے پر سکون زندگی گزارنے کا خواب دیکھا تھا۔اس خواب کو پورا کرتے کرتے کتنی ماؤں، بہنوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو قربانی دینی پڑی۔

ناول نگار کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے سکھوں کو قیام پاکستان کے بعد بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد سکھوں کو ہندوں کی چال کا پتا چلا کہ انہیں تو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا گیا لیکن اس خون خرابے کا نتیجہ مسلمانوں کو علاحدہ آزاد ملک کی صورت میں مل گیا۔ان تمام مہاجرین کو یہاں کی مقامی آبادی نے خوش آمدید کہا اور ان کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے۔

ناول نگار نے جہاں سکھوں کے منفی کردار کو اجاگر کیا ہے وہیں اس نے ان کرداروں کا حوالہ بھی دیا ہے جو ان مسلمانوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کے عادی تھے اور مذہب کے ایک نہ ہونے کے باوجود بھائی چارے کے بندھن میں بندھے تھے۔ یہی بھائی چارہ ایک مرتبہ پھر ناول کے راوی کو اپنے آبائی وطن کی یاد دلاتا ہے اور ان سے ملنے کے لئے بھارت جانے کا ارادہ کرتا ہے جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ وہ امرتسر پہنچتا ہے جہاں اسے ستر سال قبل والے کرداروں کا دوبارہ سامنا ہوتا ہے جو مسلمانوں سے محبت اور نفرت کرتے تھے آج بھی ہیں۔ایک مقام پر ایک ہندو مسلمان عورت کے ساتھ اپنے تعصب کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''ایک ہندو کسٹم انسپکٹر نے سبز پاسپورٹ زمین پر دے مارا، جس پر خاتون کہتی ہے:

''تم نے میری نہیں پریذیڈنٹ آف پاکستان کی توہین کی ہے'' (۱۸)

ناول کے مرکزی کردار کی ایک مثبت سوچ رکھنے والے سکھ کردار سے بھی ملاقات ہوتی ہے جو آج بھی مسلمانوں سے ویسی ہی محبت کرتا ہے۔ یہ کردار امرتسر ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرتا ہے جو پاکستانی مسافروں سے کم اجرت پر بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہاں ناول نگار نے سکھوں کے اس حسن سلوک کو واضح کیا ہے جو سوائے چند شر پسند عناصر کے باقی سب میں موجود تھا۔ وہ قلی کافی دیر تک مرکزی کردار کے ساتھ بات چیت میں مصروف رہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مسلمانوں اور سکھوں کے مابین پائے جانے والے بھائی چارے کا احوال سناتے ہیں۔

ناول میں ایک مقام پر سکھوں پر طنز کیا گیا ہے کہ انھوں نے جن کے کہنے پر مسلمانوں پر ظلم ڈھائے آج وہی انھیں بھارت کی سرزمین پر اچھوت سمجھتے ہیں اور اقلیت کا درجہ دیتے ہیں:

''دیکھیں سردار جی''۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔آپ ایک
بڑے مطالبے خالصتان سے دستبردار ہو کر محض اپنے علاقے

کو پنجابی صوبہ کہلانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ہندو
نے سکھ قوم کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام خالصتان دینے
کے وعدے پر کروایا تھا۔ وہ مقصد پورا کر کے ہندو اپنے وعدے
سے مکر گیا اب پنجابی صوبہ آپ کو کس خوشی میں دے گا؟ ہندو
نے جو کام آپ سے لینا تھا لے لیا اب کیسا خالصتان اور کیسا پنجابی
صوبہ؟ سردار جی آپ بھولے بادشاہ ہیں۔ ان کے آگے ہاتھ
جوڑیں اور ان کی غلامی میں اب خوش رہیں۔"(۱۹)

ناول نگار نے سکھوں کو غلام قوم سے تشبیہہ دی ہے۔ اس بات کا احساس سکھوں کو بھی ہو چکا ہے اور وہ قیام پاکستان سے آج تک علاحدگی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لیکن ہندو ان کی تحریک کو دباتے ہوئے ان کے حقوق سلب کر رہا ہے۔ سکھ قوم اب یہ سوچتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ان کی عزتیں بھی محفوظ تھیں اور انہیں برابر کے حقوق بھی ملتے تھے۔ ہجرت کے وقت مسلمانوں سے ان کے گھر بار، دولت وغیرہ چھین لیا گیا ان کی پامالی کی گئی لیکن اس کے باوجود مسلمان ایک آزاد ملک لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ناول نگار نے سکھوں کو اپنی غلطی پر نادم دکھایا ہے۔ ناول کے راوی سے ایک سکھ یہ مکالمہ کرتا ہے:

"سچ کہتا ہوں"۔۔۔۔ سکھ نے کہا۔۔۔۔۔۔ اب مسلمان
ہمارے درمیان نہیں تو ہم اپنے کئے پر پچھتا رہے ہیں جناب
آپ لوگوں سے خوب رونق تھی۔ یہ ہندو قوم تو سڑیل ہے ان
کو دیکھنے کو دل نہیں کرتا۔"(۲۰)

ناول کا مرکزی کردار جیسے ہی اپنے آبائی علاقہ پٹیالہ پہنچتا ہے تو اسے تصور میں آزادی سے قبل ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کے مناظر نظر آنے لگتے ہیں۔ دربار سنگھ کی بیوی "رجی"۔ "جوگندر" ببر سنگھ اور گاؤں کے دیگر کردار راوی کے گرد ایک جھرمٹ بنا لیتے ہیں۔ یہاں ناول نگار نے سکھوں کی مسلمانوں سے محبت کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ سکھ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ یہ بٹوارا ہو اور مسلمان ہم سے جدا ہو جائیں۔ چونکہ ہندو انگریز کی غلامی کرتا آرہا تھا انگریز نے ہندو قوم کو نوازنے کے لئے فتنہ کی بنیاد رکھ کر خود برصغیر سے نکل گیا۔ جس کی سزا آج تک دونوں قومیں بھگت رہی ہیں۔ کسی حد تک مسلمان ہندو کے غلبے سے نکل کر الگ آزاد مملکت لینے میں کامیاب ہو گئے لیکن انگریز نے ناانصافی کی ایسی لکیر کھینچی جو آج تک نہیں مٹ سکی۔

اس داستان کا راوی پٹیالہ کے جس علاقہ میں گیا وہاں اسے مایوسی ہی مایوسی دیکھنے کو ملی۔آزادی کے وقت جس زمین میں مسلمانوں کا خون جذب ہوا، جہاں لاکھوں شہیدوں کی قربان گاہیں بنیں ان جگہوں پر راوی اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرنا چاہتا ہے۔ناول کا راوی یہ محسوس کرتا ہے کہ آج بھی ہندو کی عیاری مسلمانوں کے ساتھ ویسی ہی ہے اور سکھوں کو سوائے پچھتاوے اور مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔

ناول کا مرکزی کردار اور سکھدیو سنگھ اپنے آبائی گاؤں میں ایک مقام پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ان کے درمیان وہی پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ شجاعت اور بہادری کی داستانیں سناتے ہوئے دونوں انسانی سطح کے بھائی چارے کو ایک مرتبہ پھر پروان چڑھاتے ہیں۔یہاں سکھدیو سنگھ اچانک اپنے بڑوں کے کئے پر نادم ہوتا ہے جو ان کے بڑوں نے مسلمانوں کے ساتھ آزادی کے وقت کیا۔ سکھدیو اپنے بزرگوں کے مظالم کو دھونا چاہتا ہے اور اس کا اظہار وہ بار بار کرتا ہے کہ سکھوں کو اس بات کا اب احساس ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کو قتل کروا کر ہندو لیڈروں نے اپنا سیاسی مقصد پورا کیا اور بعد میں انہیں کچھ نہ دیا۔ سکھ قوم کا ہندوؤں سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔اور اب ان کے دلوں میں ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے لئے محبت بڑھ چکی ہے۔ سکھ قوم آج بھی فسادات کے بھیانک واقعات کو بھلا کر دیرپا اور مضبوط محبت کی خواہاں ہے۔ لیکن مسلمان عورتوں اور مردوں پر کئے جانے والے مظالم اپنی ایک الگ تاریخ رکھتے ہیں۔آج بھی وہ باتیں اور وقت یاد کر کے مسلمان ایک خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی کلچر، ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور : طبع اول، ۱۹۹۹، ص ۴۰۵

۲۔ ڈاکٹر شعیب عتیق خان، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ کے اثرات، بیکن بکس، لاہور: ۲۰۱۴، ص، ۳۴۹

۳. India wins Freedom, Maulana Abdul Kalam Azad, Orient Longman 1959-1989 complete version.

۴۔ عنایت اللہ، لہو جو ہم بہا کے آئے، علم و عرفان پبلشرز، لاہور: ۲۰۰۹، ص ۱۳

۵۔ ایضاً ص، ۱۷۔۱۶

۶۔ ایضاً، ص، ۲۲

۷۔ایضاً، ص، ۳۷
۸۔ غیاث الدین، شیخ، ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ، نگارشات پبلشرز، لاہور: ۱۹۹۹، ص، ۶۳
۹۔ عنایت اللہ، لہو جو ہم بہا کے آئے، ص، ۴۵
۱۰۔ایضاً، ص، ۴۷
۱۱۔ڈاکٹر شعیب عتیق خان، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ کے اثرات، ص، ۱۲۲
۱۲۔ عنایت اللہ، لہو جو ہم بہا کے آئے، ص ۵۴
۱۳۔ایضا، ص، ۷۵
۱۴۔ایضا، ص، ۷۷
۱۵۔ایضا، ص، ۸۵
۱۶۔ایضا، ص، ۸۸
۱۷۔ایضا، ص ۹۹
۱۸۔ایضا، ص، ۱۰۲
۱۹۔ایضا، ص، ۱۰۷
۲۰۔ایضا، ص، ۱۰۹